ثمرات

محمد حنیف ندوی

# تاثرات

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا دستور تعویق و التوا کے جھمیلوں سے نکل کر بالآخر اشاعت پذیر ہو ہی گیا ہے اور اب یہ چند دن کی بات ہے کہ مناسب بحث و تمحیص اور ترمیم و اصلاح کے بعد یہ ہماری عملی زندگی کا اہم جز قرار پائے۔ ہمیں کچھ شبہ نہیں کہ شروع ہی سے اس مسئلہ میں پیچیدگیوں پر پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہیں اور اصلاح اور سلجھاؤ کی کوششوں کے باوجود بل پر بل پڑتے گئے یہ بھی صحیح ہے کہ ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیں آٹھ سال کی طویل مدت صرف کرنا پڑی لیکن اس پر ماتم کرنے اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ قومی زندگی کی تعمیر و ساخت میں آٹھ سال کا یہ عرصہ کچھ زیادہ نہیں۔ بشرطیکہ ہمیں ایسا دستور ملے جو ہمارے نظریات و تصورات کے عین مطابق ہو۔ اور پاکستان کے دونوں بازو اس پر متفق ہوں۔

اگر اس دستور میں اسلامی اقدار کے تحفظ کی ضمانت موجود ہے اور ان کو فروغ دینے اور نافذ کرنے کے عزائم کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگر اس میں عدل و انصاف کی فیض رسانیوں کو عام رکھا گیا ہے۔ اور ایسا اہتمام کیا گیا ہے کہ غریب سے غریب انسان بھی بانچی سے اونچی عدالت کے دروازوں پر دستک دے سکے اور اپنے حقوق کے لئے جرأت و آزادی سے لڑ سکے۔ اور اگر اس میں کوشش کی گئی ہے کہ حرام کا معیار زندگی بڑھے، اور دولت و ثروت کی فراوانیاں، گھوم پھر کر کسی ایک ہی طبقہ میں مرتکز نہ ہو جائیں۔ تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ دل سے اس کو سراہیں گے۔ اور کہیں گے کہ آٹھ سال کا یہ زمانہ ہم نے قطعی ضائع نہیں کیا۔ ہم اس عرصہ میں ایسا آئین مرتب کر ڈالنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جو ہماری انفرادی و اجتماعی امنگوں کا آئینہ دار ہے اور اس لائق ہے کہ اس کو فخر کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کر سکیں۔

لیکن کیا یہ درحقیقت ایسا ہی آئین ہے۔ اور اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کے ہم خواہشمند تھے؟ ہمارا یہ جواب ہے کہ اس میں ان تمام مقاصد کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور اس میں ایسے امکانات ہیں کہ جن کو زندہ اور باشعور جماعتیں آگے بڑھا سکتی ہیں۔

ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں۔ جو صرف الفاظ حروف اور پیرایہ بیان کی وضاحتوں پر تکیہ کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اصل اہمیت قوم کو حاصل ہے۔ اگر اس میں فکر و عمل کی صلاحیتیں زندہ ہیں۔ تو اس کا دستور زندہ ہے اور اصلاح و ترقی کی گنجائش موجود ہے اور اگر خدانخواستہ اس میں جان نہیں ہے۔ تو پھر حقیقی مسئلہ یہ نہیں کہ آئین کی دفعات کیا ہیں۔ اور قانون کے تیور کیسے ہیں؟ پھر مسئلہ تو ہے کہ اس قوم کو کیونکر زندگی بخشی جائے اور کیونکر اس لائق ٹھہرایا جائے کہ یہ زندگی کی صحیح کیفیتوں سے بہرہ مند ہو۔ قوموں کی ذہنی و عملی صلاحیتوں کے اختلاف سے ایک اچھے خاصے اور معقول دستور کی افادیت کے دائرے بھی کیونکر مختلف رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔

اس کا تماشہ دیکھنا ہو تو مغرب کی جمہوریتوں کی طرف نظر دوڑائیے۔ کیا فرانس اور اٹلی میں وہی جمہوریت رواج پذیر نہیں جو انگلستان میں ہے، لیکن اس کے باوجود جس تواتر و تسلسل کے ساتھ انگلستان میں جمہوری قدروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ کیا فرانس اور اٹلی میں ایسا ہونا ممکن ہے؟ اور جو شاندار نتائج و ثمرات جمہوریت سے انگریز قوم حاصل کرتی ہے۔ کیا اس کا عشر عشیر بھی فرانس اور اٹلی والوں کو میسر ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں جب اصول ایک ہے، جڑ اور بنیاد میں کوئی فرق نہیں۔ تو برگ و بار میں یہ عظیم تفاوت کیوں ہے؟ اس لئے اور محض اس لئے کہ قوموں کی صلاحیت کار اور نشاط کردار کے درجے مختلف ہیں۔

ذرا کیوں جائیے۔ اسلام کی تاریخ پر ہی غور کیجئے۔ جب تک عربوں نے خدا کے اس دین کو اپنائے رکھا۔ اس کی تخلیق و فتوحات کے دائرے وسیع سے وسیع تر ہوتے رہے لیکن جونہی دوسری قوموں نے اس کا تجربہ کیا، اس میں سٹاؤ، جمود اور زوال و انحطاط کے علائم پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ سبب ظاہر ہے۔ عربوں میں زندگی، فعالیت اور تخلیق تھی لہٰذا ان کا اختیار کردہ مسلک بھی ان اوصاف حمیدہ کا حامل تھا اور دوسری قوموں میں چونکہ یہ چیزیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اسلام ایسے تخلیقی اور فعال مذہب کو ماننے کے باوجود اس کے روشن پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم عمدہ دستور اور ناقص دستور میں جو فرق ہے اس کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ یا اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ اگر دستور میں اسلامی و جمہوری قدروں کے پنپنے کے مواقع پورے پورے نہ مہیا کئے جائیں۔ تو عملاً ان بلند نصب العینوں کے پانے میں سخت دشواریاں حائل ہو سکتی ہیں۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کا نچوڑ دو لفظوں میں یہ ہے کہ صرف دستور ہی فیصلہ کن چیز نہیں اور اسی پر ہماری خوشیوں اور مایوسیوں کا انحصار نہیں۔ یہ اگر ناقص ہے تو اس کو بدلا جا سکتا ہے اور کامل ہے تو اس سے زیادہ کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ بہرحال کام ہونا چاہیئے اور فکر و عمل کی تازہ کاریوں کے لئے نئی نئی جولانگاہوں کی تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے۔

ہم مانتے ہیں کہ موجودہ دستور میں جھول رہیں گے اور رہنے چاہئیں۔ کیونکہ یہ انسانی دستور ہی تو ہے۔ اس میں قدرتاً وہ کمال اور ہمہ گیری نہیں ہو سکتی جو وحی و الہام کا خاصہ ہے۔ مزید برآں اسمیں اس وجہ سے بھی نقائص کا پایا جانا ضروری ہے کہ اس کو ایک ہی ہم آہنگ پارٹی کے معتقدات کے مطابق ترتیب نہیں دیا گیا۔ بلکہ مختلف افکار و نظریات رکھنے والی پارٹیوں نے مل جل کر ترتیب دیا ہے۔ پھر اسمیں جو کھچڑی رہ گئے ہیں۔ ان کا رہ جانا اس بنا پر بھی ضروری ہے کہ پاکستان ایک ہی جغرافیائی وحدت کا نام نہیں۔ بلکہ ایسے دو خطوں پر مشتمل ایک ریاست سے تعبیر ہے۔ جن میں صرف سینکڑوں کوس کا فاصلہ ہی حائل نہیں۔ ضروریات، نقطۂ نظر اور تہذیبی ثقافت کا اختلاف بھی حائل ہے۔ لہٰذا ان حالات میں کوئی ایسا دستور معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتا جس سے کہ ہر ہر گروہ کے جذبات کی تسکین ہو سکے۔ ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ جانبداری کا خیال رکھے بغیر اصولاً تمام صحتمند پہلوؤں کو اپنا لیا جائے۔ اور ہر ہر گروہ کے ان مطالبات کو مان لیا جائے جس سے کہ ملک مستحکم ہوتا ہے اور قوم کے اختلافات دور ہوتے ہیں۔ اور ہم وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ترتیب دستور میں اس نزاکت کا خیال رکھا گیا ہے۔

پاکستان کے دستور کا مسئلہ صرف ایک دستور کی تدوین و ترتیب کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک نئے فکر، نئے تجربے اور مثالی نظریاتی ریاست کو منصۂ شہود پر لانے کا مسئلہ ہے۔ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی کہ ایک ملک آئین طیار کرتا ہے، اور جس طرح دوسرے ملکوں کا ایک جمہوری ضابطۂ حیات ہے اسی طرح کا ایک نظام یہاں بھی تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ قائم کرنا ہے تو اس کے لئے زیادہ تردّد جیص بیص اور غور و فکر کی ضرورت نہ تھی بشکل یہ ہے کہ پاکستان سرے سے ان معنوں میں ایک مملکت ہی نہیں۔ اس کی حیثیت ایک آئیڈیالوجی اور مخصوص انداز ذلیت کی ہے۔ یہی وہ انقلاب انگیز خیال تھا جس کی وجہ سے پاکستان نے جنم لیا ورنہ وسیع و عریض اور متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایسا گیا گذرا نہ تھا کہ ہندوؤں کے دوش بدوش زندگی نہ بسر کر سکتا۔ پاکستان ہمارے نقطۂ نظر سے تاریخ اسلامی کی پہلی معتمند کروٹ ہے۔ اس سے اگر کما حقہٗ فائدہ نہ اٹھایا گیا اور نئے عہد کی بنیاد نہ رکھی گئی تو اس کا نقصان برداشت کرنے کے لئے ہمیں ہر وقت آمادہ رہنا چاہیئے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ صدیوں کے بعد ہمیں اپنے افکار و نظریات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جو موقع ملا تھا اس کو ہم نے اپنے اختلافات کے سبب کھو دیا۔ صدیوں کے بعد ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ اسلامی تاریخ کی درخشانیوں کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اس پر جو ملوکیت کا اقتدار چھایا ہے تو اس استبدادی اور مضبوطی کے ساتھ کہ ادھر تیرہ چودہ سو سال تک کوئی سیاسی نظریہ نہیں ابھر سکا۔ اور ملوکیت کی پٹی ہوئی اور ظالمانہ راہ سے ہٹ کر حکومت و ریاست کی کوئی عادلانہ اور جمہوری شکل معرض وجود میں نہیں آسکی۔ اب اگر خوش بختی سے ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ کہ ہم اسلامی اقدار اور موجودہ عصری نظریات و افکار کو سمو کر ایک معتدل، متوازن اور ترقی پذیر ریاست کی طرح ڈال سکیں تو ہمیں نہایت، اخلاص کے ساتھ اس کے لئے جدوجہد کرنا چاہیئے اور موجودہ آئین پر اس زاویۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے۔ کہ اس میں ایسی ریاست کے اصولی خدوخال کی نشاندہی کی گئی ہے یا نہیں اور آیا اس کو مان کر، اور تسلیم کر کے ہم ایک ایسی زندگی کی ابتدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ رہا نقائص اور کوتاہیوں کا سوال تو ان کو ہم ہر وقت دور کرنے پر قادر ہیں۔

---

گذشتہ ماہ کتنے ناموروں کو دست اجل نے ہم سے چھین لیا۔ مولینا اسلم جیراجپوری کا انتقال ہوا۔ قاضی عبدالغفار چل بسے مولینا محمد علی کنیٹب اللہ کو پیارے ہو گئے، اور مولینا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور پروفیسر عبدالقادر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اس قحط الرجال میں ان لوگوں کا داغ مفارقت دے جانا، بہت کھلتا ہے مگر کیا کیا جائے اس عالم فانی کا یہی وتیرہ ہے، یہاں جو آیا چلنے کے لئے اور جس نے بزم حیات میں قدم دھرا۔ اٹھنے اور رفیقوں اور دوستوں کو رنجیدہ کرنے کے لئے۔ لہٰذا صبر اور دعائے مغفرت کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

مولینا اسلم جیراجپوری ان چند علماء میں تھے جو اپنی آنکھ سے دیکھتے اور اپنے نقطۂ نگاہ سے مسائل دینی پر غور کرتے ہیں ان کی تربیت اور تعلیم کی منزلیں اگرچہ ان فضاؤں میں طے ہوئیں جن کو نواب صدیق حسن خاں کے ذوق علم نے مہیا کیا تھا، تاہم یہ شدت و طباعی کے سبب اس روش پر قانع نہ رہ سکے اور مجبور ہوئے کہ اجتہادات اور جدت انفرادیت کے لئے الگ راہیں اختیار

کریں۔ نیکی، سادگی اور اخلاص، ان کی فطرت کی وہ نمایاں خوبیاں تھیں۔ جو ان سے کبھی الگ نہیں ہوئیں۔ تہجد التزام سے پڑھتے تھے۔ احباب اور عزیزوں سے اس طرح ملتے تھے کہ اس سے پوری پوری یگانگت ٹپکتی تھی اور تکلف یا مولویانہ پندار تو نام کو نہیں تھا۔ سب سے بڑھ کر قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ نہایت کم تنخواہ پانے پر بھی ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے کہ جن کے یہ کام آسکیں۔ اور بسا اوقات اپنے اس پاکیزہ جذبہ کی تسکین کے لئے اس طرح اخفا برتتے تھے کہ ان کے اس عمل پر اعلےٰ درجے کے تصوف کا شبہ ہونے لگتا۔ اول اول پیسہ اخبار کے سلسلہ ادارت میں منسلک رہے، پھر علیگڑھ میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور اس کے بعد جب جامعہ ملیہ نے علیحدگی اختیار کی تو بقیہ زندگی اس کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ تصنیفات میں تاریخ الامت اور حیات حافظ نے اچھی خاصی مقبولیت حاصل کی۔ کئی تحقیقی مقالے لکھے، جن میں خصوصیت سے وہ مضامین دیکھنے کے لائق ہیں جن میں انہوں نے وراثت و فرائض کی بعض گتھیوں کو سلجھایا ہے۔

قاضی عبدالغفار بلند پایہ اور صاحب طرز ادیب تھے، عموماً لوگ ان کو "لیلےٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک ان کی کتاب "نقش فرنگ" کا جواب نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ مرحوم اپنے اس رنگ کو قائم نہ رکھ سکے۔ تاہم غنیمت ہے کہ ادبیات و صحافت کی مصروفیات کے باوجود آثار جمال الدین اور آثار ابوالکلام ایسے شاہکاروں کو ترتیب دے سکے۔ مولانا محمد علی کنٹیب کی ذات گرامی ایک مستقل جنبش قلم چاہتی ہے مشرق و مغرب کے خزائن علم کھنگالے ہوئے، انگریزی پر وہ عبور کہ کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ مگر بات بات میں اسلام اور اسکی محبت و عشق کے شعلے آزاد خیالی اور روشن ضمیری کے ساتھ تدین کا یہ نباہ ہم نے صرف ان میں دیکھا ہے اور رشک کیا ہے۔ مصلحت کوشی و مصلحت بینی کے بالکل قائل نہیں تھے، جس بات کو غلط سمجھتے تھے پورے زور سے لومۃ لائم کی پروا کئے بغیر اس کی تردید پر آمادہ ہو جاتے تھے اور اس کی خاطر اپنے بڑے سے بڑے مفادات کو خطرہ میں ڈال دیتے تھے۔ مشترکہ ہندوستان کی ہر اس تحریک میں دلیرانہ شریک رہے جس سے انگریز کے استعمار پر زد پڑتی تھی۔ زندگی میں لاکھوں روپے کمائے اور لاکھوں خدا کی راہ میں خرچ کئے۔ آہ اب ایسے لوگ کہاں۔

مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی اہلحدیث کے نامور علماء میں تھے۔ ان کی پوری زندگی کتاب و سنت کی اشاعت میں گذری۔ نہایت محققانہ کتابیں لکھیں اور مخالفینِ اسلام کو شافی جوابات دیئے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ سے ان کی عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ اس بارے میں ادنےٰ گستاخی کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ کچھ لوگ ان کی اس عادت سے واقف تھے۔ اسلئے عمداً حضرت امام کا تذکرہ چھیڑ دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مولینا ان کے مناقب و فضائل ان کے زہد و تقویٰ اور فقہ و اجتہاد کی بے نظیر صلاحیتوں پر ایک اچھی خاصی تقریر کر ڈالتے بسا اوقات فرطِ عقیدت سے آبدیدہ ہو جاتے اور کہتے کہ افسوس لوگوں نے ان کے مرتبہ کو نہیں پہچانا۔

پروفیسر عبدالقادر مدتوں اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ تاریخ اسلامی کا خصوصی ذوق رکھتے تھے، ملنے جلنے میں نہایت مخلص اور متواضع تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے اور اعزہ و اقارب کو صبر کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین